خالد ہمایوں

بت کدے میں اذان

عطاء المحسن شاہ جیؒ کو پہلی دفعہ میں نے مسجد حیاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم (گجرات) میں دیکھا اور سنا۔ ماہ و سال کا تعین کرنے میں حافظہ ساتھ نہیں دے رہا۔ یہی کوئی تیس بتیس سال پہلے کی بات ہوگی۔ مسجد حیاۃ النبی ﷺ میں ان دنوں مولوی نذیر اللہ خان صاحب مرحوم و مغفور خطبۂ جمعہ دیتے تھے‘ وہ دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل تھے۔ کچھ عرصہ سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کی مسجد (فیصل گیٹ) میں ان کے نائب کے طور پر رہے پھر مسئلہ حیاۃ النبی ﷺ پر ان سے اختلاف کیا اور نزدیک کے محلے کی ایک مسجد میں جا بیٹھے۔ محلے اور مسجد دونوں کا نام حیاۃ النبی ﷺ رکھ دیا۔ کچھ روز بحث مناظرے کا بھی بازار گرم رکھا‘ یہ ایک الگ داستان ہے‘ مولانا وعظ خوب کرتے تھے‘ آواز کراری تھی‘ تقریر میں اکابر دیوبند کے قصوں کے پیوند لگاتے لطف دوبالا ہو جاتا۔ ایک دفعہ دورانِ تقریر فرمایا کہ امیر شریعت حضرت سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاریؒ کے فرزند ارجمند سید عطاء المحسن بخاری تشریف لائے ہیں‘ جمعہ کی نماز کے بعد خطاب کریں گے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی۔ سوچا امیر شریعتؒ کو تو نہیں دیکھ سکے، ان کے صاحبزادے ہی کو سن لیتے ہیں، چنانچہ جمعہ کی نماز کے بعد کافی لوگ رک گئے۔ شاہ جی نے خطبہ مسنونہ کے بعد قرآن مجید کی چند آیات تلاوت کیں تو دل روحانی انبساط سے بھر گیا، گھڑی گھڑی خیال آتا کہ اگر عطاء المحسن بخاری کا لحن اتنا دلپذیر ہے تو حضرت بخاریؒ کا کیا عالم ہوتا ہوگا؟ غالباً تقریر کا کوئی خاص موضوع متعین نہیں تھا۔ اتنا یاد ہے کہ انہوں نے مولانا نذیر احمد خان صاحب سے گزارش کی تھی کہ اختلافی مسائل نہیں چھیڑنے چاہئیں، یہ دیکھنا چاہیے کہ آج کی دنیا میں مسلمانوں کو کس طرح کے مسائل درپیش ہیں اور خود اسلام کی آج حالت کیا ہے؟ شاہ جی اپنی وضع قطع سے بھی بڑے مختلف معلوم ہوئے، انداز و اطوار سے روایتی قسم کے مولوی معلوم نہیں ہوتے تھے۔ قد دراز، جسم بھرا بھرا اور ٹھوڑی پر گنے چنے بال۔ بہرحال ذہن پر اپنی شخصیت کا ایک بھلا سا نقش بٹھا گئے۔

دوسری بار بھی انہیں اسی مسجد میں دیکھا، لیکن اب کے وہ سامعین سے مخاطب نہیں ہوئے۔ تیسری بار وہ ۱۹۷۰ء کے ہنگامہ خیز دنوں میں گجرات تشریف لائے اور چوک نواب صاحب میں ایک جلسۂ عام میں تقریر کی۔ یہ تقریر خالص سیاسی قسم کی تھی۔ سوشلسٹوں کو بھی خوب لتاڑا اور اسلام پسند جماعتوں پر اس حوالے سے تنقید کی کہ وہ غریب اور مزدور کی بات کیوں نہیں کرتیں۔

ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں ایک روز سنا کہ شاہ جی گجرات ہی میں مستقل طور پر مقیم ہو گئے ہیں اور چوک نواب صاحب کی جامع مسجد میں جمعہ کا خطبہ دیا کریں گے۔ چنانچہ میں نے باقاعدگی سے جمعہ کو وہاں حاضری دینی شروع کر دی،

میں ان دنوں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے افکار و خیالات سے بہت متاثر تھا۔ ان کی کتابیں پڑھ رکھیں تھیں بلکہ ان پر چاروں طرف سے جو حملے ہو رہے تھے' ان سے بھی خوب واقف تھا۔ شاہ جی جمعہ کے خطبے میں اکثر مولانا مودودیؒ کی کتاب ''خلافت وملوکیت'' کو ہدف تنقید بناتے تھے۔ میں بڑے غور سے ان کی ہر تقریر سنتا اور پھر خط کی صورت میں ان کی بعض باتوں پر جرح کرتا۔ اتفاق سے شورش کاشمیریؒ کی لفاظی میرے ذہن میں خوب اتری ہوئی تھی۔ اسی اسلوب کی پیروی کرنے سے خط کی تحریر خطیبانہ ہی بن جاتی۔ شاہ جی کی اگلے جمعہ کی تقریر سے مترشح ہوتا کہ میرا خط پڑھ چکے ہیں۔

ایک روز میرے اسلامی جمعیت طلبہ کے نوجوان ساتھیوں اور یا مقبول جان اور جاوید احمد نے مجھ سے پوچھا کہ آپ شاہ جی کو خطوط وغیرہ لکھتے ہیں؟ میں نے اقرار کر لیا۔ دونوں دوست کہنے لگے، ہم شاہ جی سے ملتے رہتے ہیں۔ اگلے روز ہم نے انہیں کہا کہ آپ ہر جمعے مولانا مودودیؒ ہی کو موضوع کیوں بنا لیتے ہیں؟ وہ کہنے لگے' جماعت والے مجھے خط لکھتے ہیں۔ یہ خالد ہمایوں کون ہے؟ ہم نے کہا ہمارا ساتھی ہے' اسے آپ سے ملائیں گے۔ اگلے جمعہ کو نماز کے بعد میں اپنے ان دوستوں کی معیت میں شاہ جی سے ملا تو بے حد خوش ہوئے، گلے لگا لیا کہنے لگے تمہارے خطوں سے لگتا تھا کہ شاید تم کوئی روایتی سے مولوی ہو گے۔ اس کے بعد شاہ جی سے مسلسل نشست و برخاست رہنے لگی۔ ایک دفعہ وہ ہمارے گھر بھی آئے۔ والدہ صاحبہ نے فوراً ہمسائے سے اپنی بڑی بہن کو بھی بلا لیا کہ آؤ، بخاری صاحب کے صاحبزادے آئے ہیں، چنانچہ خالہ بھی آ گئیں۔ دونوں بہنوں نے بے حد خوشی کا اظہار کیا، دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ کہنے لگیں: امیر شریعتؒ جب سیالکوٹ کے جلسوں میں آتے تھے تو ہم بڑے ذوق شوق سے ان کی تقریر سننے جاتے تھے۔ اس وقت لوگ انہیں ڈنڈے والا پیر کے نام سے یاد کرتے تھے۔

گجرات کی سیاست پر عرصہ دراز سے دو گھرانوں کی اجارہ داری چلی آ رہی تھی۔ ایک گھرانے کا تعلق گوجر برادری سے تھا اور اسے انگریزوں سے نوابی ملی ہوئی تھی، اس لیے یہ لوگ نوابزادے کہلاتے تھے۔ دوسرا گھرانہ بٹ برادری کا نمائندہ تھا' چودھری ظہور الٰہی مرحوم اس کے سربراہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد چودھری صاحب نے کاروبار کو فروغ دیتے ہوئے سیاست میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان کی سیاست نوابزادہ فیملی کے لیے بہت بڑا چیلنج بن گئی، ان دو گھرانوں کے سامنے کسی کا چراغ جلنا ناممکن تھا۔ شاہ جی دونوں گھرانوں کی منافقتوں کا بڑی دلیری کے ساتھ پردہ چاک کرتے۔ لوگ حیران ہوتے کہ گجرات کے بُت کدے میں یہ کون اذان دینے آ گیا ہے؟ شاہ جی تو ان بٹ برادران کو بھی معاف نہ کرتے جنہوں نے شاہ جی کو اپنی مسجد میں خطبہ جمعہ دینے کے لیے بلا رکھا تھا۔ شاہ جی کسی سے لیتے لواتے تو تھے نہیں اس لیے کسی مصلحت کا شکار ہونا جانتے ہی نہ تھے۔

شاہ جی تقریر تو اردو میں کرتے لیکن درمیان میں پنجابی محاورے اور ضرب الامثال بھی ٹانکتے چلے جاتے۔ شین قاف کی درستی کا یہ عالم کہ لگتا تھا دہلی اور لکھنؤ میں بھی عمر کا ایک حصہ گزار آئے ہیں۔ سرائیکی بلکہ رہتکیوں کی زبان بھی بول لیتے۔ فارسی، عربی اور اردو اشعار بلکہ پنجابی بولیوں اور ٹپوں سے بھی خوب کام لیتے، قرآن مجید کی قرأت بھی خوب لطف

دیتی تھی، جی چاہتا وہ پڑھتے رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ اپنے باپ دادا کی طرح قرآن کے حافظ تھے، تراویح بھی پڑھاتے تھے، زندگی کا مشاہدہ وسیع تھا۔ لوگوں کے غلط رویوں اور منافقتوں پر خوب گرجتے تھے۔ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کی خباثتوں اور جاہ پرستیوں کے یوں بخیے ادھیڑتے کہ شاید ہی کبھی کسی نے اس طرح زبان کھولی ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بغض رکھنے والوں کی ہر ہر ادا سے واقف تھے، ان سے بھی کبھی رورعایت نہ کرتے۔

شاہ جی مداہنت سے کام لینے والے نہ تھے۔ جو دل میں ہوتا وہی زبان پر ہوتا۔ دوں فطرت لوگ بٹ برادران کے کان بھرتے کہ شاہ جی تو تمہیں بھی معاف نہیں کرتے۔ سچ سننا اور سنتے رہنا بڑے ظرف کی بات ہوتی ہے۔ بٹ برادران کے لیے بالآخر شاہ جی کی حق گوئی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ شاہ جی نے ان کے تیور دیکھے اور سلسلہ خطابت وہاں سے منقطع کرلیا۔

مجلس احرار اسلام کا مرکزی دفتر دہلی دروازے (لاہور) سے مسلم ٹاؤن میں منتقل ہوا تو شاہ جی سے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی۔ پھر وہ صاحب فراش ہوگئے۔ ایک اتوار میں اور ڈاکٹر شاہد محمود کاشمیری سارا دن ان کی خدمت میں بیٹھے رہے۔ دوپہر کے وقت مولانا عبدالقادر آزاد بھی مزاج پرسی کے لیے تشریف لائے۔ شاہ جی کی صحت اب کے ایسی بگڑی کہ سنبھالا نہ لے سکی۔ کچھ خود بھی زیادہ دیر پرہیز کی قید میں رہنے والے نہ تھے۔ آخر ایک روز سن لیا کہ شاہ جی اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں۔ آخری دیدار سے محرومی کی حسرت دل ہی میں رہ گئی۔ رات بھر سفر کر کے دار بنی ہاشم پہنچا اور اگلی صبح ان کی آخری آرام گاہ پر حاضری دی۔ نزدیک ہی حضرت امیر شریعتؒ اور ان کے فرزندِ اکبر سید ابوذر بخاریؒ بھی آسودہ خاک ہیں۔ اسلام کے ان جلیل قدر فرزندوں کی مغفرت کے لیے ہاتھ اٹھائے تو آنکھیں بھر آئیں۔ سوچنے لگا قدرت نے ہمیں ایسے بے لوث رہنما عطا کیے کہ جن کی زبان اور عمل میں فاصلہ نہ تھا، جن کی رفتار اور گفتار قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد دلاتی تھی۔ خدا کرے کہ ہم ان کے بتائے ہوئے رستے ہی پر چلتے چلتے ایک روز خدا سے جا ملیں......!